تکفیری رجحانات کی فکری اساس

مولوی عبد الصمد کریم زائی*
ترجمہ: مہدی باقر

عصر حاضر میں دنیائے اسلام کے لیے اختلاف اور انتشار بالخصوص تکفیری گروہوں کے کارنامے سب سے بڑا مسئلہ ہیں کیونکہ اس گروہ نے اپنی بہیمانہ حرکتوں سے اسلام اور مسلمانوں کی آبرو اور حیثیت کو شدید نقصان پہونچایا ہے۔ ان لوگوں نے ایسے دین کو جو سراسر دین امن وآشتی ہے، خون ریزی اور شدت پسندی کے مذہب کے طور پر دنیاوالوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ اسلام ہی وہ دین ہے جو اغیار کے ساتھ بھی اخلاقی رواداری کا حکم دیتاہے۔ ایسی حالت میں تکفیری رجحان نہ صرف اسلامی تعلیمات کو مسخ کرتاہے بلکہ خود مسلمانوں کو بھی دائرہ اسلام سے خارج کرنے کی بات کہتاہے تاہم سارے فرقِ اسلامی کے برخلاف سب کو کافر ومشرک قرار دیتاہے؛ ظاہر ہے کہ اس قسم کی فکر، اسلام کے خارجی دشمنوں سے کم خطرناک نہیں ہے۔ یہ اس کینسر کے پھوڑے کی طرح ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے جسم میں گھر چکا ہے چنانچہ اس کے نتیجہ میں ہر روز عالم اسلام کے متعدد لوگ اس کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں تاہم اس سے مسلمانوں کے انفرادی تشخص پر بھی کڑی ضرب لگتی ہے البتہ اس سلسلے میں دنیا کی سامراجی طاقتوں کے کرداروں اور مسلمانوں کی فریب خوردگی کو نظر انداز نہیں کیاجاسکتا چونکہ اسلام دشمن قوتیں یہ بات بخوبی سمجھ چکی ہیں کہ مسلمانوں کو کمزور کرنے کا ایک آسان راستہ ان کے مابین تفرقہ اندازی ہے اسی لیے وہ الگ الگ انداز میں اس قسم کے گروہوں کی حمایت کرتے ہیں۔ کاش تکفیری گروپ کے اسلحے بجائے مسلمانوں کی جان لینے کے اسلام کے دفاع میں استعمال ہوتے۔

اسلامی مکاتب فکر اور تکفیری رجحانات کی رو سے توحید اور شرک کا تقابلی جائزہ

توحید مصدر ہے فعل "وحد یوحد" کا اور اس کے معنیٰ یکتا اور یگانہ قرار دینا ہے۔[۱] تاہم اصطلاحی طور پر یہ لفظ اللہ کی ذات پر ایمان واعتقاد اور الوہیت، اسماء اور صفات کی وحدانیت کے اعتراف سے مربوط

* موصوف ایران شہر کی مسجد فاطمہ زہرا(س) کے امام جمعہ اور مدرسہ خدیجۃ الکبریٰ کے مدیر ہیں۔

ہے چنانچہ توحید تین صورتوں میں تحقق پذیر ہوتی ہے:

الف۔ اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت پر یقین اس معنٰی میں کہ اس کے وجود اور یکتا ہونے اور اس کے تمام افعال پر عقیدہ ہو جیسے خلاقیت، رزاقیت، زندہ کرنا، مارنا اور تمام امور پر اس کا کامل تصرف اور تدبیر کرنا "الا لہ الخلق والامر تبارک اللہ رب العالمین۔ ۲ (جان لو کہ خلقت اور حکمرانی اسی کے لیے ہے) "الحمد للہ رب العالمین" ۳ (تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو عالمین کا رب ہے)۔ تاریخ بشریت میں اکثریت انہیں لوگوں کی ہے جو اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت پر یقین رکھتے ہیں جیسا کہ خود خداوند متعال نے فرمایا ہے؛ قل من یرزقکم من السماء والارض ام من یملک السمع والابصار ومن یخرج الحی من المیت ویخرج المیت من الحی ومن یدبر الامر فسیقولون اللہ" ۴ (بتاؤ کون زمین وآسمان سے تمہیں رزق دیتا ہے، کون تمہارے کان اور آنکھوں کا مالک ہے کہ جو مردہ کو زندہ اور زندہ کو مردہ کرتا ہے اور کون تمام امور کی تدبیر کرتا ہے عنقریب سب کہیں گے وہ اللہ ہے۔" ولئن سألتہم من خلق السماوات والارض لیقولن اللہ۔ ۵ (اگر ان سے پوچھو کہ زمین وآسمان کو کس نے پیدا کیا ہے تو یقیناً کہیں گے کہ اسے خدا نے خلق کیا ہے۔

ب۔ اللہ کی الوہیت میں اس کی وحدانیت ویکتا پرستی پر یقین یعنی اس کی عبادت میں اسے وحدہ لاشریک قرار دینا جیسے نماز، روزہ، زکوۃ، حج، قربانی اور اس سے مدد کا مطالبہ کرنا، اللہ ارشاد فرماتا ہے: فاعلم انہ لاالہ الّا اللہ، ۶ (جان لو کہ کوئی خدا نہیں ہے سوائے اس کے)؛ قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین لا شریک لہ وبذالک امرت وانا اول المسلمین۔ ۷ (کہو کہ میری نمازیں ساری عبادتیں، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور مجھے یہ حکم ملا ہے اور میں ہی پہلا مسلمان ہوں) "ایاک نعبد وایاک نستعین ۸ (تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں) ومآامروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفآء ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوٰۃ وذلک دین القیمہ" ۹۔ (انہیں حکم نہیں دیا گیا مگر یہ کہ وہ خدا کی عبادت کریں اس کے دین کے تئیں خلوص پیدا کریں، نماز پڑھیں، زکوۃ دیں، یہی پائیدار میرا دین ہے)۔ وماخلقت الجنّ والانس الاّلیعبدون۔ ۱۰۔ مختلف آیات قرآنی میں متعدد انبیاء جیسے جناب نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ اور شعیبؑ کی زبانی آیا ہے: اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہ ۱۱ (اللہ کی عبادت کرو اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے)۔

ج۔ اللہ کی صفات اور اس کے اسماء اس کی یکتائی اور بے ہمتائی پر ایمان، یعنی وہ اسماء وصفات الٰہیہ جو اس کی ذات سے متصف ہیں اور معتبر احادیث میں ان کا ذکر ہے کسی مثال، تشابہ اور اس کی صفات کی

کیفیات کی نفی کرتے ہوئے۔ خداوند کریم ارشاد فرماتاہے :" لیس کمثلہ شئ وھو السّمیع البصیر ۱۲۔(اس کے جیسی کوئی شی نہیں ہے وہ سمیع وبصیر ہے)۔ وللہ الاسماء الحسنیٰ فادعوہ بھا وذروا الذین یلحدون فی اسمائہ سیجزون ماکانوا یعملون ۱۳۔ (تمام اسماء حسنی اللہ کی ذات سے مخصوص ہیں اسے اسی نام سے پکارو اور جنہیں اس کے اسماء سے انکار ہے انہیں چھوڑ دو وہ اپنے کیفر و کردار کو پہونچ جائیں گے)۔" ولم یکن لہ کفواً احد ۱۴۔ (اس کا کوئی کفو نہیں ہے)، ولایحیطون بہ علما۱۵۔ (علم ودانش اس کا ادراک واحاطہ نہیں کر سکتے)۔ ھل تعلم لہ سمیّا ۱۶۔ (کیا اس کا کوئی ہمنام ہے)؟

ابن ابو العز حنفی نے توحید کی دو قسمیں بیان کی ہیں: ربوبیت میں توحید اور اسماء وصفات میں توحید ۱۷۔

اہل کلام کے نزدیک توحید کی قسمیں:

متکلمین نے توحید کی تین قسموں کو اس طرح بیان کیا ہے:

۱۔ توحید، ذات میں یعنی اللہ اپنی ذات وہستی کی رو سے قابل تقسیم نہیں ہے۔

۲۔ توحید، صفات میں یعنی اس کی صفات میں اسکا کوئی مشابہ نہیں ہے۔

۳۔ توحید افعال میں یعنی اس کے افعال میں اس کا کوئی شریک نہیں ۱۸۔

پہلی والی قسم مناسب تر ہے چونکہ باقی تقسیموں کو متکلمین نے مراتب توحید میں نہیں جانا ہے البتہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اس مسئلہ کو اس سے بہتر انداز میں بیان کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے توحید کو چار موارد پر مشتمل جانا ہے الوہیت کی توحید کو چوتھے مرحلے میں قرار دیا ہے۔

توحید کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ حصر وجوب وجود، ذات باری تعالیٰ میں، چنانچہ اس کے علاوہ کوئی واجب الوجود نہیں ہے۔

۲۔ حصر خلقت عرش: یعنی زمین وآسمان اور تمام موجودات ومخلوقات کا ذات اللہ تبارک و تعالیٰ سے متعلق ہونا۔

واضح رہے کہ ان دونوں اقسام سے متعلق آسمانی کتابوں میں ذکر ملتا ہے چنانچہ اس حوالہ سے یہودی اور عیسائیوں کے یہاں بھی کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا ہے یہی نہیں بلکہ قرآن کریم نے اسے مسلمات میں سے جانا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ولن سألتھم من خلق السموات والارض لیقولنّ

خلقهن العزيز العليم ۱۹۔ (اگر ان سے پوچھا جائے کہ زمین وآسمان کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ یقین سے کہیں گے کہ اسے اسی قادر مطلق نے پیدا کیا ہے)۔

۳۔ حصر تدبیر آسمان، زمین اور جو کچھ اس کے مابین ہے۔

۴۔ اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

یہ دونوں قسمیں اپنے فطری متقضیات کے پیش نظر ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ ۲۰۔ مشرک کے لغوی معنی، شراکت، حصہ داری اور شرکت کے ہیں، مالهم فيهما من شرک۔ ۲۱ شرک کو سمجھنے کا سب سے آسان طریقہ اس کا توحید کے ساتھ موازنہ ہے اس طرح توحید کو بھی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور شرک کو بھی، اس لحاظ سے شرک بھی دو قسم کا ہوتا ہے: ۱۔ شرک نظری ۲۔ شرک عملی۔

شرک نظری یعنی اللہ کے بارے میں ہمارا نظریہ خلاف توحید ہو، تاہم شرک نظری کو خدا کی صحیح معرفت نہ ہونے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے چونکہ شرک نظری، توحید نظری کے بالکل مقابل اور متضاد ہے جس کے پیش نظر اس کی مختلف جہات ہیں جن میں ہم سر دست شرک ذاتی، شرک صفاتی اور شرک افعالی کو بیان کر رہے ہیں:

شرک ذاتی یعنی دو یا اس سے زائد خدا پر یقین رکھنا جسے اصطلاحاً ثنویت یا تثلیث کہا جاتا ہے، شرک ذاتی پوری طرح توحید ذاتی کے برخلاف ہے۔ شرک افعالی یعنی اللہ کے علاوہ کسی اور کے خالق موجودات ہونے کا قائل ہونا جیسے زرتشت معتقد تھے کہ دو خدا ہیں ایک نیکیوں کا خالق ہے دوسرا بدیوں کا، چنانچہ وہ یزداں کو خوبیوں کا اور اہرمن کو بدیوں کا خدا جانتے ہیں۔ وہ قدریہ فرقہ کی طرح الٰہی قضا وقدر کے منکر ہیں اور جملہ خیر وشر کو خود سے منسوب کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ فرقہ جبریان کے بالکل برخلاف ہے جو خود کو قضا وقدر کے مقابل بالکل مجبور گردانتے ہیں، روایت میں ہے" القدريه مجوس هذه الامة" اور اسی طرح ستارہ کی پرستش کرنے والے جنہیں بعض کے خیال میں قرآن نے صائبون کے نام سے یاد کیا گیا ہے، یا وہ لوگ جو مخلوقات خدا جیسے چاند سورج وغیرہ کو خدا کا شریک قرار دیتے ہیں۔ یہی شرک عملی یعنی عبادت وپرستش میں خدا کا شریک قرار دینا ہے تاہم یہی وہ شرک ہے جو توحید عملی کے بالکل مقابل میں ہے۔

لہٰذا قرآن کریم میں ذکر شدہ عبادت وبندگی کے وسیع معنی ومفہوم کو، مد نظر رکھتے ہوئے شرک عملی کی تصویر مزید واضح ہو جاتی ہے۔ بندگی وعبادت، قرآن کریم میں محض کسی طاقت کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا اور اسے اپنا خالق ومالک جاننا نہیں ہے بلکہ قرآن نے بندگی کو ایسے تذلل اور تسلیم ہونے سے تعبیر کیا ہے جو اللہ کے سامنے اطاعت کی نیت سے ہو، اس سلسلے میں قرآن کریم کی متعدد آیات سے بات

مزید واضح ہو جاتی ہے:

"ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت" ۲۲۔(۱) الم اعھد الیکم یا بنی آدم ان لا تعبدوا الشیطان" ۲۳۔ اور آیت، "وتلک نعمتہ تمنھا علی ان عبدت بنی اسرائیل" ۲۴۔ حضرت موسیٰ سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: "یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروابہ"۔۲۵۔ وغیرہ

کیا کسی نے شیطان کو سجدہ کیا یا طاغوت کو خالق کائنات جانا ہے۔ کیا سارے بنی اسرائیل فرعون کو سجدہ کرتے تھے، کیا ایسی کوئی آیت نازل ہوئی ہے؟ نہیں بلکہ اس سے مراد خود کو ان کے آگے جھکا دینا ہے۔ چنانچہ صرف ہر وہ اطاعت وخود سپردگی اور عبادت جو خدا کے لیے ہو، توحید عملی ہے اور اگر خدا کے لیے نہ ہو تو شرک ہے لہٰذا توحید کا لازمہ یہ ہے کہ پہلے انسان خود کو ہر طرح کے غیر اللہ کے غلبہ اور گرفت سے آزاد کرے، ہر قسم کی خود پرستی، ثروت پرستی، شکم پرستی اور طاغوت پرستی سے دور کرے حکم پروردگار عالم کے سامنے سرخم کرے اور اس کے برخلاف ہر حکم وبالا دستی کو جو الٰہی احکام سے متعارض ہو ٹھکرادے۔

جیسا کہ حضور اکرمؐ کا فرمان "لاطاعۃ لمخلوق فی معصیہ الخالق" ۲۶۔ اس پر واضح دلیل ہے۔

شرک خفی وجلی

اگر شرک بالکل آشکار ہو جیسے کوئی ثنویت یا تثلیث کا قائل ہو تو اسے شرک جلی کہا جاتا ہے ایسی صورت میں انسان حتمی طور پر دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے التبہ یہ ذہن نشین رہے کہ کچھ ایسے مراحل بھی ہیں جس میں شرک اپنی واضح اور صریحی تصویر کے ساتھ ابھر کر نہیں آتا اور اس میں ایک قسم کا خفا پایا جاتا ہے، دین اسلام کے تمام منابع جیسے " سد الذرائع" کے باب میں اسے شرک خفی کا عنوان دیا گیا ہے مثلاً بعض احادیث میں غیر خدا کی قسم کھانا شرک سمجھا گیا ہے "من حلف بغیر اللہ فقد کفر او اشرک" ۲۷۔ یا اسے ریا کہا گیا ہے، " الشرک اخفی فی امتی من دبیب المنتہ" ۲۸۔ شرک کی رفتار دلوں اور فکروں میں ایسی چیونٹی سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے جو رات کی تاریکی میں صاف پتھر پر چلتی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے اگر کوئی خواہشات نفسانی کی پیروی کرتا ہے یا جاہ وطلب، شہوت پرستی اور ذخیرہ اندوزی کرتا ہے تو وہ شرک خفی کا شکار ہے، "اریت من تخذ الھہ ھواہ"۔۲۹۔

تکفیریوں کے یہاں شرک یعنی اللہ کے لیے شریک کا قائل ہونا یا اس کے علاوہ کسی اور کو صاحب اختیار ماننا ہے اسی طرح طلب ومدد اور توسل بھی شرک ہے۔

اسلامی فرقے اور تکفیری رجحانات کی رو سے ایمان و کفر کا تقابلی جائزہ

ایمان کے لغوی معنی تصدیق اور تعین کرنے کے ہیں البتہ اسے اطمینان واعتبار کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے جبکہ شرعی اصطلاح میں اسے دینی مسائل کی تصدیق اور راسخ تعیین سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس لحاظ سے اجتہادی مسائل کی تصدیق کہ جس کے لیے ضروری معلومات کو سبب نہیں قرار دیا جاسکتا ایمان کے متحقق ہونے کے لیے کافی نہیں ہے تاہم اس کا انکار کفر کا سبب بھی نہیں بنتا، اس سلسلے میں الگ الگ نظریات ہیں۔ ایک گروہ نے ایمان کے ۳ /ارکان بتائے ہیں:

۱۔ دل سے تصدیق

۲۔ زبان سے اقرار

۳۔ اعضاء وجوارح سے اظہار (عمل)

محدثین کہتے ہیں کہ عمل صالح، رکن ایمان ہے اور رکن کی دو قسمیں ہوتی ہیں: اصلی اور فرعی۔ عمل اس کے فرعی ارکان میں شمار کیا جاتا ہے اور اس کی مثال یوں دی جاتی ہے کہ درخت کی شاخ کو جب درخت سے الگ کیا جائے تو اسے اس درخت کا نام دیا جاتا ہے۔ معتزلہ اور خوارج نے بھی ایمان کو ۳ چیزوں سے مرکب جانا ہے اس طرح سے کہ ان تینوں میں سے کسی ایک کے فقدان سے ایمان جاتا رہے گا چنانچہ عقلی قاعدہ یہ ہے کہ کوئی بھی مرکب شئ اپنے بعض اجزاء کے نہ ہونے کی صورت میں کالعدم ہو جاتی ہے۔

البتہ معتزلہ اور خوارج کے مابین ایک بات میں اختلاف ہے اور وہ یہ ہے کہ معتزلہ کہتے ہیں عمل صالح کو ترک کرنے یا گناہ کبیرہ کے مرتکب ہونے سے نہ انسان مومن رہ جاتا ہے نہ ہی کافر بلکہ ایک تیسری صنف قرار پاتا ہے یعنی فاسق ہو جاتا ہے درحالیکہ خوارج کہتے ہیں ایسا انسان دائرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے اور کافر سمجھا جاتا ہے۔

علم کلام کے ماہرین اور محققین نے ایمان کو بسیط جانا ہے وہ کہتے ہیں کہ ایمان تائید قلبی کا نام ہے مگر زبان سے اقرار اور اعضاء وجوارح سے اظہار اس کی شرائط میں ہے اور اس کو اس جہت سے شرط شمار کیا گیا ہے تاکہ وہ لوگ جو قلباً یقین ومعرفت رکھتے ہیں مگر اعلانیہ طور پر اس کی گواہی نہیں دیتے اس سے خارج سمجھے جائیں، چنانچہ انہوں نے اقرار کو ناشکری وناسپاسی کے مقابل پایا ہے" وجحدوا بها و استيقنتها انفسهم ظلما وعلواً ۳۰" (باوجود اس کے کہ وہ اپنے تئیں یقین رکھتے تھے مگر انہوں نے تکبر، نخوت اور ظالمانہ روش کے سبب انکار کر دیا)۔

البتہ اقرار اس صورت میں شرط ہے کہ کوئی عذر موجود نہ ہو کیونکہ زبانی اقرار، ڈر، اور خوف کے

ماحول میں ساقط ہوجاتا ہے جیسا کہ قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے، "الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان"۔۳۱ (علاوہ ان افراد کے کہ جو بالا کراہ زبان پر کفر جاری کریں مگر دل سے ان کا ایمان ثابت ہو)۔

لہٰذا اگر کوئی غیر اضطراری موقع پر، کلمہ شہادتین کو زبان پر جاری نہ کرے تو کافر ہے جیسا کہ اگر کوئی اسلام سے ناطہ نہ جوڑے اور کفر سے بھی اظہار برأت نہ کرے تو مسلمان نہیں ہے البتہ اس سلسلے میں علماء کی رائے مختلف ہے۔ جنہوں نے ایمان کو مرکب جانا ہے وہ ایمان کی کمی و زیادتی کے بھی قائل ہیں برخلاف ان لوگوں کے جو بساطت ایمانی کے قائل ہیں۔

محدثین نے ایمان کے دو مراتب بیان کیے ہیں:

پہلا مرتبہ: دل سے تصدیق، اس کے نتیجہ میں آتش دوزخ سے نجات ممکن ہے چاہے جتنی مدت بھی اس میں رہنا میسر رہا ہو۔

دوسرا مرتبہ: زبان و عمل سے اقرار واظہار، اس کے نتیجہ میں بہشت میں داخلہ ممکن ہے چنانچہ اگر عمل صالح نہ ہو تو بھی ایمان محفوظ ہے۔

مذکورہ گفتگو کے پیش نظر، منافق ایمان کی دلی تصدیق سے بے بہرہ ہے اور اس کا شمار مومنین میں نہیں ہوسکتا جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔ ومن الناس من یقول امنا باللہ وبالیوم الآخر وماھم بمؤمنین۔۔۳۲

فقہا اور علم کلام کے وہ علماء جنہوں نے ایمان کو بسیط جانا ہے، انہوں نے عمل صالح کو اس کے احکام پر عمل درآمد کی شرط اور باعث زینت وانبساط جانا ہے۔

کفر اور اس کی قسمیں

کفر کی دو قسمیں ہیں: حقیقی و حکمی، کفر حقیقی یعنی مبانی دین میں سے کسی ایک کا انکار کرنا اور اس کی چار قسمیں؛ صاحب تاج العروس نے ان چار قسموں کا تذکرہ کیا ہے:

۱۔ کفر انکاری یعنی انکار توحید دل اور زبان سے

۲۔ کفر جحودی یعنی خدا کو پہچانتے ہوئے زبان سے اقرار نہ کرنا جیسے شیطان

۳۔ کفر عناد ولجاجت یعنی وہ خدا کو پہچانتے ہوئے زبان سے اقرار بھی کرتا ہے۔ مگر ایمان لانے سے گریز کرتا ہے۔ جیسے ہرقل۔

۴۔ کفر نفاق یعنی ظاہراً اقرار کرتا ہے، مگر دلی طور پر کافر ہے جیسے منافقین

حصکفی کہتے ہیں: کافروں کو ۵ طرح تقسیم کیا جاسکتا ہے؛ ایک وہ جو خالق کائنات کا انکار کرتا ہے جیسے

دھریہ، دوسرے وہ جو وحدانیت خدا کا انکار کرتا ہے جیسے ایک سے زائد خدا کے ماننے والے لوگ، تیسرے وہ جو بعثت پیغمبر کا انکار کرتا ہے؛ چوتھے وہ جو اللہ اور اس کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کا انکار کرتا ہے پانچویں وہ جو تمام دلی مراحل کو طے کر چکا ہے مگر حضور اکرم کی رسالت کو قبول نہیں کرتا ہے۔

کفر حکمی وہ کفر ہے کہ جس میں کفار کی کوئی نشانی یا انکار یا ایسا شعار پایا جاتا ہو جس سے اسلام کی تکذیب ہوتی ہو، جیسا کہ شرح موافق میں اشارہ ملتا ہے؛ فیض الباری کے حاشیہ میں کفر کی اقسام کے بارے میں یوں درج ہے: اگر کوئی اسلام کا ظاہری اقرار و اعلان نہ کرتا ہو تو کافر ہے اور اگر زبانی طور پر اقرار کرتا ہے مگر دل میں کفر چھپائے تو وہ منافق ہے تاہم اگر دلی وزبانی اعتراف بھی کرتا ہے مگر بعض دینی مسلّمات کی اجماع امت کے برخلاف تفسیر کرتا ہے ایسا انسان زندیق ہے جیسے اگر وہ کہے کہ جو کچھ بھی قرآن میں جنت و جہنم کے بارے میں ہے وہ حق ہے مگر اسکا وجود خارجی نہیں ہے بلکہ جنت سے مراد خوشحالی اور جہنم سے مراد ندامت و پشیمانی کا تصور ہے۔

مراحل کفر، شیعی نقطہ نظر سے:

امام صادقؑ سے مروی رایت کے مطابق کفر کو پانچ مراحل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے پہلا مرحلہ انکار ربوبیت، دوسرا مرحلہ حق کو جانتے ہوئے اس کا انکار! تیسرا مرحلہ کفران نعمت، چوتھا مرحلہ سنت الٰہیہ کو ترک کرنا اور پانچواں مرحلہ اسلام سے بیزاری ہے۔

تکفیر شیعوں کی نظر میں

الوہیت، توحید، رسالت پیغمبر، قیامت اور منجملہ اسلامی قوانین کا انکار موجب کفر ہوتا ہے خواہ وہ لاعلمی کی بنیاد پر ہو۔ اس کے علاوہ اگر کوئی خدا کے علاوہ کسی اور کے لئے ربوبیت کا قائل ہو تو وہ بھی کفر سمجھا جائے گا۔ خدا کی جسمانیت کا قائل ہونا بھی کفر ہے علاوہ ازیں، نماز کو ہلکا گردانا واجبات کا انکار کرنا، محرمات کی حرمت سے انکار، اہل بیت رسولؐ کو ناروا کہنا، حضرت علیؑ کو غیر مؤمن جاننا ان کی اطاعت سے انکار کرنا رسول کی آلؑ سے بغض رکھنا مصادیق کفر میں شامل ہے۔

تکفیریوں کا گروہ تمام مسلمانوں کو کافر سمجھتا ہے البتہ یہ ان کی ظاہر پرستی کے نتیجہ میں ہوا ہے وہ محض ظاہری خضوع و خشوع کو عبادت جانتے ہیں جیسے خوارج ہر اس شخص کو اسلام سے خارج مانتے تھے جو کسی گناہ کبیرہ کا شکار ہوتا تھا۔

اہل قبلہ کی حرمت تکفیر قرآن وسنت میں

شرعی نصوص سے ثابت ہے کہ تکفیر میں عجلت درست نہیں ہے، حضرت عبداللہ ابن عمر کہتے ہیں کہ رسولؐ نے فرمایا :" ایما رجل قال لاخیہ، یاکافر فقد باء بھا احدھما متفق علیہ، اگر کوئی اپنے مسلمان بھائی کو کافر کہے تو ان دونوں میں کوئی ایک قطعاً کافر ہوگا۔

موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اللہ نے ارشاد فرمایا ہے: " یاایھا الذین آمنوا اذا ضربتم فی سبیل اللہ فتبیّنوا ولا تقولوا لمن القٰی الیکم السّلام لست مومناً تبتغون عرض الحیاۃ الدنیا"۔ ۳۳

پیغمبرؐ نے فرمایا: "من صلی صلاتنا واستقبل قبلتنا واکل ذبیحتنا، فذلک المسلم الذی لہ ذمہ اللہ ذمۂ رسولہ فلا تحقروا اللہ فی ذمتہ"۔ آپ نے فرمایا: " ثلاث من اصل الایمان: الکف عمن قال لا الہ الا اللہ، لانکفرہ بذنب ولا تخرجہ من الاسلام بعمل۔۔۔"

عن ابی ھریرہ، قال: کان النّبیﷺ بارزاً یوما للناس فاتاہ رجل فقال: ماالایمان؟ فقال: الایمان ان تؤمن باللہ وملائکتہ وتؤمن بالبعث، قال: وماالاسلام؟ قال الاسلام ان تعبد اللہ ولا تشرک بہ شیاء وتقیم الصلوٰۃ وتؤتی الزکوٰۃ المفروضہ وتصوم رمضان ۳۴

ایک دوسری حدیث (جو صحیح بخاری اور مسلم میں درج ہے) میں بھی ایمان کی یہی تعریف پیش کی گئی ہے۔" عن طلحہ بن عبید اللہ: قال: جاء رجل الیٰ رسول اللہ من اھل نجد نا ثر الراس نسمع دویّ صوتہ ولا نفقہ ما یقول حتی دنی فاذا ھو یسئل عن الاسلام، فقال رسول اللہ(ص): خمس صلوت فی الیوم واللیلۃ: قال: ھل علی غیرھا؟ قال: لا الا ان تطوع، قال: فادبر الرجل وھو یقول واللہ لاازید ولا انقص: قال رسول اللہﷺ: افلح ان صدق " ۔۳۵

سنن نسائی میں انس ابن مالک سے یوں منقول ہے: من شھد ان لا الہ الا اللہ واستقبل قبلتنا وصلی صلاتنا واکل ذبیحتنا فذلک مسلم، لہ ماللمسلم وعلیہ ما علی المسلم ۳۶

اہل قبلہ کی تکفیر کی حرمت علمائے اسلام کی نظر میں

اسلامی شریعت نے تکفیریت کے لیے شرائط اور موانع کا تذکرہ کیا ہے اور اسے خاصی اہمیت دی ہے اسی لیے کفر کا حکم لگانے سے پہلے بغیر کسی تعصب وتنگ نظری کے تمام ضروری اور ممکنہ پہلوؤں پر نظر ڈالنے کا حکم دیا ہے اور محض ان لوگوں کو ایسا حکم جاری کرنے کا حق ہے جو مجتہد یا قاضی ہیں اور جو مسائل شریعہ پر نظر نہیں رکھتے اور اپنے لیے بھی حرام وحلال کی تشخیص نہیں دے سکتے بلکہ وہ اس سلسلے میں دوسرے کے محتاج ہیں وہ کسی بھی طرح اس سلسلے میں لب کشائی کا حق نہیں رکھتے۔

ایک ایسا قاعدہ جسے اہل سنت بھی تسلیم کرتے ہیں "اہل قبلہ کی تکفیر جائز نہیں ہے" ومن قواعد اهل السنه والجماعه ان لایکفر واحد من اهل القبله" ، عن ابی حنیفه: لاتکفر اهل القبله بذنب، اس کے علاوہ متعدد روایات میں اس کی طرف اشارے ملے ہیں : رسول خدا نے فرمایا : " ثلاث من اصل الایمان :الکف عمن قال لا اله الا الله ولا تکفر ولا تخرجه من السلام بعمل"- تین چیزیں ایمان کا ستون ہیں وحدانیت کی گواہی دینے والے کے قتل سے گریز کرنااور ایسے انسان کو کافر نہ سمجھنااور کسی نامطلوب عمل یا گناہ کے نتیجہ میں ہے اسلام سے خارج نہ کرنا۔۳۷، امام ابو جعفر طحاوی نے ابو حنیفہ سے روایت کی ہے: انا لانکفر احداً من اهل القبیله بذنب مالم یستحله ولا نقول لایضر مع الایمان ذنب لمن عمله ۳۸، البتہ اہل قبلہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو قوانین اسلام، روز قیامت اور اللہ پر یقین رکھتے ہیں۔

ملا علی قاری لکھتے ہیں:" فمن واظب طول عمره علی الطاعات والعبادات مع اعتقاد قدم العالم ونفی الحشر او نفی علمه سبحانه وتعالیٰ بالجزئیات لا یکون من اهل القبله عند اهل السنه "؛ اگر کوئی ساری عمر عبادت کرے اور کسی ایک اصول دین کا انکار کرے تو وہ کافر ہے اور اسے اہل قبلہ ہی شمار نہیں کیا جاسکتا۔۳۹

افسوس کی بات یہ ہے کہ آج اسلامی معاشرہ جس عجیب صورت حال سے دوچار ہے وہ بہر حال تکفیری افراط و تفریط کی دین ہے اس طرح سے کہ ان میں سے بعض لوگ، کسی مسلمان کو معمولی ترین ناشائستہ عمل پر دائرہ اسلام سے خارج کردیتے ہیں۔ اگر کسی مسلمان سے خلاف شرع کوئی عمل سرزد ہو جائے عملی طور پر یا گفتاری طور پر کہ جسے کفر پر حمل کیئے جانے کا احتمال بہت ضعیف ہو یا اس عمل یا قول کے حکم کے سلسلے میں مجتہدین میں اختلاف رائے ہو یعنی ان میں سے کچھ نے اس کو باعث کفر نہ جانا ہو تو اس صورت میں اس شخص پر کفر کا حکم نہیں لگایا جاسکتا جب تک وہ خود اپنے مطمح نظر کو واضح نہ کرے۔

بنابریں، مسلمانوں پر کفر کا حکم لگانا بہت خطرناک عمل ہے جیسے کہ کافر کو مسلمان جاننا بھی کم خطرناک جرم نہیں ہے۔ اس رخ سے ان لوگوں کے ساتھ جو واضح طور پر اسلام کی مخالفت کرتے ہیں مضبوط موقف اور واجب کارروائی کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ایسے لوگوں کے برخلاف لازمی اقدامات نہ کرنا اسلام کے لیے مضر ہے جیسے مسیلمہ کذاب اور وہ لوگ جو حضور اکرمؐ کی وفات کے بعد مرتد ہوگئے خلیفہ اول نے ان کے ساتھ جہاد کیا۔ لہٰذا جب تک کسی مسلمان کے قول یا عمل کی تاویل پیش کرنے کی گنجائش ہو اور فقہاء اور مجتہدین کے مابین اختلاف رائے ہو اور وہ افراد قوانین اسلام کے منکر نہ ہوں، قطعاً مسلمان ہیں انہیں کافر نہیں کہا جاسکتا۔

ملا علی قاری: ، شرح فقہ اکبر میں امام ابو حنیفہ سے نقل کرتے ہیں: لانکفر احداً من اھل القبلہ؛ اس کے بعد فرماتے ہیں یہ اکثر فقہا کا نظریہ ہے[۴۰]۔ فخر الدین رازی نے کہا ہے: کفر اس علم کا انکار ہے جو پیغمبر اکرمؐ، اللہ کی جانب سے لائے تھے چنانچہ کوئی بھی اہل قبلہ کافر نہیں کہا جاسکتا۔[۴۱]۔ قاضی عضد الدین ایجی اس سلسلے میں فرماتے ہیں: اکثر علم کلام کے ماہرین اور فقہاء کا ماننا ہے کہ کسی بھی اہل قبلہ کو کافر نہیں کہا جاسکتا۔[۴۲]

ابن حزم اندلسی کہتے ہیں: کسی مسلمان کو کسی فتویٰ یا کسی موضوع پر کہی جانی والی بات پر کافر نہیں قرار دیا جاسکتا؛ اس کے بعد وہ فرماتے ہیں اس سلسلے میں امام ابو حنیفہ، شافعی وغیرہ کی بھی رائے یہی ہے۔" وذھبت طائفۃ الی انہ لایکفر ولا یفسق مسلم بقول قالہ فی اعتقاد اوفتیا وان کل من اجتھد فی شئ من ذل فبان بما رأی انہ الحق فأنہ ماجور علی کل حال ان اصاب فاجران وان اخطا فاجر واحد، وھذا قول ابن ابی لیلی وابی حنیفہ والشافعی وسفیان الثوری وداود بن علی وھو قول کل من عرفنالہ قولا فی ھذہ المسئلہ من الصحابہؓ لانعلم منھم خلافا فی ذل اصلاً[۴۳]۔ ایک گروہ کا ماننا ہے کہ کسی مسلمان کو کسی فتویٰ یا عقیدتی مسئلہ پر کافر یا فاسق نہیں قرار دیا جاسکتا ہر انسان اپنے علم اور اجتہاد کے سہارے اگر کسی نتیجہ پر پہونچتا ہے وہ اس کے لئے حجت ہوتا ہے یہی ابن ابی لیلیٰ، امام ابو حنیفہ، امام شافعی سفیان توری اور داؤد بن علی کا نظریہ ہے اور بہر حال یہ نظریہ صحابہ کرام کے طرز فکر سے مختلف نہیں ہے۔

ایک بزرگ سنی عالم دین نے الیواقیت والجواہر میں شیخ تقی الدین السبکی کے قول کو نظر میں رکھتے ہوئے تحریر فرمایا ہے: اعلم یا اخی ان الاقدام علی تکفیر المومنین عسراً جدّا وکل من فی قلبہ ایمان یستعظم القول بتکفیر اھل الاھواء والبدع مع قولھم لاالہ الا اللہ، محمد رسول اللہ، فان تکفیر امر ھائل عظیم[۴۴]۔ امام غزالی بھی ایسے فلسفیوں کو جو دنیا کے قدیم ہونے کے قائل اور معاد جسمانی کے منکر ہیں مستحق تکفیر جانتے ہیں[۴۵]، مگر وہ فرق کلامی کے بارے میں یوں فرماتے ہیں: اسلامی فرقوں کے لیے ان کے نقطہ ہائے نظر کے مطابق جب تک ممکن ہو انہیں تکفیر کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے، قبلہ رو نماز پڑھنے والوں اور کلمہ شہادتین پڑھنے والوں کا خون بہانا بہت بڑا جرم ہے، ہزار واجب القتل کافروں سے ترک قتال بہت آسان ہے ایک مسلمان کا خون بہانے کے مقابل پیغمبرؐ فرماتے ہیں: میں لوگوں سے اس وقت تک جہاد کرسکتا ہوں جب تک وہ کلمہ شہادتین زبان پر جاری نہ کرلیں۔[۴۶]

تکفیری اور خوارج کے انکار میں ظاہری، اعتقادی اور عملی مماثلتوں کا جائزہ

تکفیر خود تکفیریوں اور خوارج کے مابین اہم مشترکات میں سے ایک ہے۔ یہ دونوں گروہ پوری تاریخ میں مسلمانوں کے خون ومال کو مختلف بہانوں سے مباح جانتے رہے ہیں۔

البتہ تکفیری، خوارج سے اس سلسلے میں آگے نکل گئے ہیں کیونکہ خوارج گناہ کبیرہ کے مرتکب افراد کو کافر شمار کرتے ہیں مگر تکفیری ان مسلمانوں کو جو مناسک شرعی پر عمل پیرا ہیں اور ان کے سیاسی مفاد میں ان کے ہمراہ نہیں ہیں کافر اور ان کے خون اور مال کو جائز سمجھتے ہیں۔

طائرانہ نظر میں بھی خوارج اور تکفیریوں کے بیچ شباہتوں کو دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے، خوارج و مسلمانوں کو کافر شمار کرتے تھے او ران پر تلوار چلاتے تھے اور نہ صرف ان کے مردوں کو بلکہ ان کی عورتوں اور بچوں کو کبھی مار ڈالتے تھے، جن لوگوں کو وہ قتل کرتے تھے ان میں کفار کی تعداد بہت کم ہوتی تھی۔ انہوں نے اسلامی سرزمین کو دار الحرب کا نام دیا ہوا تھا اور وسیع پیمانے پر مسلمانوں کو قتل کرتے تھے۔ تکفیری سارے مسلمانوں کو کافر اور خود کو مسلمان سمجھتے ہیں اور اسی تکفیر کو ہی قاتلانہ روش کا جواز سمجھتے تھے اور ہیں۔ یہ بھی مسلمانوں کی سرزمین کو دار الکفر سمجھتے ہیں خوارج اور تکفیریوں میں بس یہ فرق ہے کہ خوارج نے ہر چند کہ مسلمانوں کو قتل کیا مگر وہ بالعموم اس کے لیے تکفیریت کا سہارا نہیں لیتے تھے در حالیکہ تکفیری گروپ، امریکہ اور برطانیہ کی مدد سے مسلمانوں کا قتل بھی کر رہا ہے ان پر شرک وکفر کا الزام بھی لگاتے ہیں جبکہ انہیں دشمنان اسلام سے ہاتھ ملانے میں کوئی تامل نہیں ہے۔

خوارج، کلمات حق کا استعمال کرکے بالکل باطل اور غلط معنیٰ مراد لیتے تھے ان الحکم الا اللہ تکفیری بھی ظاہر آیات کے معانی سے استفادہ کرتے ہوئے باطل تفاسیر کے سہارے غلط راستوں پر چل پڑے ہیں۔ اسی طرح جیسے کہ ایمان و عمل کا تلازم خوارج کی فکری اساس ہے اور گناہ کبیرہ کا ارتکاب ان کی نظر میں دین سے خارج کر دینے کے لیے کافی ہے، تکفیریوں کے یہاں بھی وہ چیزیں جو علامت شرک نہیں ہوتیں شرک شمار کی جاتیں ہیں اور ان کا انجام دینے والا کافر ومشرک قرار پاتا ہے اور اس کا خون اور اس کا مال جائز سمجھا جاتا ہے۔ اس صورت حال کے باوجود تکفیری لوگ، تلاوت قرآن کریم، نماز یومیہ، اور دیگر واجبات ودینی فرائض کی انجام دہی میں خاصی تندہی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ خود کو عام مسلمانوں سے سبقت یافتہ بھی مانتے ہیں تقریباً یہی صورت حال خوارج کے ساتھ بھی تھی۔ یہ لوگ بھی ظواہر دین پر سختی سے پابند تھے، ان کی پیشانیوں پر سجدوں کے نشان تھے، قرآن کی خوبصورت تلاوت کرتے تھے، بہت طولانی نمازیں پڑھتے تھے: "تم میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوگا جس کے نمازی، تمہاری نمازوں کی، جس کے روزہ دار، تمہارے روزوں کی، جن کے اعمال، تمہارے اعمال کی توہین کریں گے،

قرآن پڑھیں گے مگر وہ ان کی حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ وہ لوگ دین سے خارج لوگ ہیں بالکل جیسے تیر ، کمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ " تکفیریوں اور خوارج میں محض ان کا وحشیانہ و بہیمانہ رویہ ہی ایک دوسرے سے مشابہ نہیں ہے بلکہ ان دونوں میں دیگر متعدد مشترکات بھی ہیں جن میں سے بعض کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے:

۱۔ ارادوں میں شباہت

خوارج کا شعار تھا کہ وہ آیہ ، قرآنی سے ماخوذ " لاحکم الا للہ" کو اپنے اہداف کے لئے استعمال کرتے تھے درحالیکہ اس بات کا ظاہر حق تھا مگر مراد باطل لیا۔

۲۔ تقدس مآبی میں شباہت

خوارج انتہائی متعصب اور دینی ظاہر داری کے بڑے پابند تھے اور عبادتوں میں اس قدر سنجیدگی اختیار کرتے تھے کہ پیشانیوں پر سیاہ نشان پڑ جاتے تھے وہ گناہوں سے دوری کے ساتھ ساتھ ظاہری طور پر عبادت میں خاصا اہتمام کرتے تھے۔ وہابی نقطہ نظر میں بھی خوارج کی طرح تعصب اور شدت پسندی کو ان کی دینداریوں میں خصوصی مقام حاصل ہے وہ بھی ظواہر آیات وروایات کی خصوصیت کی رعایت کرتے ہیں اور اس قدر محتاط مزاج ہیں کہ بہت سارے جدید آلات سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔

۳۔ فاسد وفرسودہ اعتقادات میں مشابہت

خوارج اپنے علاوہ سارے مسلمانوں کو کافر جانتے تھے اور اگر کسی سے گناہ کبیرہ سرزد ہو جائے تو اسے دائرہ اسلام سے خارج گردانتے تھے تکفیری بھی ان تمام مسلمانوں کو جو ان کے ہمسو اور ہم فکر نہیں ہیں کافر جانتے ہیں اور ان کی جان ومال کو حلال سمجھتے ہیں۔

۴۔ ظواہر سے استدلال کرنے میں مشابہت

خوارج اپنے موقف کے استدلال میں ظاہر آیات و روایات سے استفادہ کرتے تھے اور ان کا بھی خیال یہی تھا کہ گناہ کبیرہ کفر کا مستلزم ہوتا ہے، تکفیری لوگ بھی اسی نظریہ کے حامل ہیں۔

۵۔ مسلم سربراہان مملکت سے جنگ کرنے میں شباہت

خوارج کی نظر میں اسلامی سلطنتوں سے جنگ جائز تھی کیونکہ انکا خیال تھا کہ یہ بادشاہ ہی گمراہی اور

ضلالت کے پیشرو ہیں اور انہی کے ذریعے شرک وبدعت کو بڑھاوا ملتا ہے۔

۶۔ جنگ پسندی میں مشابہت

خوارج بھی موت کی پرواہ کئے بغیر ہمیشہ جنگ وجدال میں ملوث رہے تھے چونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ بہشت جانے کا واحد راستہ یہی ہے؛ تکفیری لوگ بھی اسی کو شجاعت اسلامی کا مظہر جانتے ہیں اور ہمیشہ برسرپیکار رہتے ہیں ان کا بھی یہی ماننا ہے یہ راستہ انہیں بہشت لے جانے والا ہے۔

۷۔ فکری تعطل میں مشابہت

خوارج بے انتہا فکری تعطل اور خشک زہد کے قائل تھے، کسی ایسے مسلمان کی جان ومال کو جو وساطت (جو کہ اللہ کی طرف سے عطا کی گئی ایک ذمہ داری ہے) کا مطالبہ کرے، حلال جانتے تھے اور اس کو قتل کردیتے تھے۔

۸۔ دین سے خروج میں مشابہت

حضور اکرمؐ نے خوارج سے متعلق فرمایا: یہ لوگ اسی طرح دین سے خارج ہیں جیسے تیر کمان سے خارج ہوجاتا ہے : یخرج فیکم قوم تحقرون صلاتکم مع صلاتھم وصیامکم مع صیامھم وعملکم مع عملھم، یقرؤن القرآن لایجاوز حناجرھم، یمرقون من الدین کما یمرق السھم من الرمیۃ ۴۷۔" تم میں ایک ایسا گروہ بھی رونما ہوگا جو اپنے اعمال یعنی نمازوں سے تمہاری نمازوں کی، اپنے روزوں سے تمہارے روزوں کی تذلیل کرے گا وہ قرآن پڑھیں گے مگر وہ ان کی حلق سے نیچے نہیں اترے گا یہ لوگ بالکل اس طرح دین سے خارج لوگ ہیں جیسے تیر کمان سے خارج ہوجاتا ہے۔" ۴۸

۹۔ قرآن کی آیات سے استفادہ میں مشابہت

جیسے خوارج، قرآن کی ان آیات کو جو مشرکوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں مسلمانوں سے نسبت دیتے تھے تکفیری لوگ بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔

۱۰۔ تکفیری کے ظاہری شمایل میں مشابہت

تکفیری بھی ظاہری طور پر خوارج کی طرح ہیں خوارج اپنے بال منڈوایا کرتے تھے۔ مشہور کتاب نہایہ کے باب تسبید میں ایک حدیث درج ہے جو خوارج سے متعلق ہے جس کے معنی بالوں کو جڑ سے تراشنا ہے۔

اسلامی افکار اور تکفیری رجحانات میں سنت وبدعت کا مطالعاتی موازنہ

کسی بھی قسم کے جدید عمل کا بدعت ہونا شرعاً مستند ہونا چاہئے اور اس کی نسبت سے ہی اس پر حکم لگانا چاہئے اور کوئی چیز بغیر شرعی فارمولوں کو بروئے کار لائے بدعت قرار دیدی جائے تو یہ درست نہیں ہے کوئی بھی نیا عمل یا طریقہ جس کا تعلق قوانین اسلام سے نہ ہو اور قرآن وحدیث اس کی تائید نہ کرتے ہوں تو وہ بدعت ہے۔

غور طلب ہے کہ تکفیری گروہ، بدعت کو روکنے کی آڑ میں مسلمانوں کی جان ومال سے کھیل رہا ہے درحالیکہ یہ نقطہ نظر کسی بھی اسلامی فرقہ کے یہاں قابل قبول نہیں ہے۔

اسلام کے مکاتب فکر اور تکفیری افکار کے آئینہ میں عالم برزخ کا تقابلی جائزہ

ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ ان مسائل میں سے نہیں ہے کہ جس کے نفی واثبات کا دارومدار کفر واسلام پر ہو بلکہ یہ ایک علمی و تحقیقی مسئلہ ہے بعض مانتے ہیں کہ مردہ، زندہ کی آواز سن سکتا ہے جبکہ کچھ یہ خیال کرتے ہیں کہ مردہ، زندہ کی آواز نہیں سن سکتا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مردہ زندہ کی آواز سن سکتا ہے ان کی دلیل "الغازی" میں درج امام بخاری کی ایک روایت ہے: ففی الصحیحین عن انس عن ابی طلحة قال لما کان یوم بدر وظہر علیھم نبی اللہ امر ببضعہ وعشرین وفی روایت اربعہ وعشرین رجل من صنادید قریش فالقوا فی طوی من اطواء بدر۔ فقال رسول اللہ قال یا ابا جھل یا امیہ یا شیبة۔ الیس قد وجدتم ماوعد ربکم حقا فانی وجدت ماوعد ربی حقا فقال عمر۔ رسول اللہ ماتکلم من اجساد لا ارواح فیھا فقال والذی نفسی بیدہ ماانتم باسمع لما اقول منہ وفی صحیحین عن ابن عمر قال: اطلع النبی علی اھل القلیب فقال وجدتم ما وعد ربکم حقا قیل لہ اتدعوا امواتا قال ماانتم باسمع منھم ولکن لایجیبون وفی روایت قال انھم الان یسمعون ما اقول :"۴۹

جو لوگ مردوں کے نہ سننے کے قائل ہیں ان کی دلیل حضرت عائشہ سے مروی ایک حدیث ہے:

عن عروہ عن عایشہ انھا قال (ما) قال رسول اللہ انھم لیسمعون الان ما اقول وقد وھم یعنی ابن عمر (انما) قال انھم لیعلمون الان ماکنت اقول لھم۔ انہ حق۔ ثم قرات قولہ تعالیٰ (انک لاتسمع الموتی وماانت بمسمع من فی القبور)۵۰ حضرت عائشہ کے علاوہ علماء کا کی اکثریت، اسی بات کی قائل ہے کہ مردہ نہیں سن سکتا ہے جیسے قاضی ابو یعلی نے جامع اکبر میں تحریر فرمایا ہے: واحتجوا بما احتجت بہ عایشہ وبانہ یجوز ان یکون ذالک معجزہ مختصہ لنبیٍ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دون غیرہ وھو سماع الموتہ کلامہ وفی صحیح البخاری قال قتادہ، احیاھم اللہ تعالیٰ (یعنی اھل القلیب)

حتی اسمعهم قوله توبيخا وتصغيرا ونقمة وحسرة وندما ۵۱؎ وذهب طوائف من اهل العلم (وهم اكثرون) وهو اختيار الطبری وغيره وكذلك ذكره ابن قتيبه وغيره من العلما وهولاء يحتجون بحديث القليب كما سبق وليس هو بوهم ممن رواه فان ابن عمر وابا طلحه وغيرهما ممن شهد القصه حكياه عن النبی صلی اللہ علیه وآله وسلم وعايشه لم تشهد ذالك (قال الحافظ ابن حجر فی فتح الباری ۵۲؎ قال السهيلی عايشه لم تحضر قول النبی صلی اللہ علیه وآله وسلم فغيرها ممن حضر احفظ للفظ النبی صلی اللہ علیه وآله وسلم ثم تعقبه ابن حجر فقال لكن لا يقدح ذلك فی روايتهما لانه مرسل صحابی وهو محمول علی انها سمعت ذلك ممن حضره او من النبی صلی اللہ علیه وآله وسلم بعد ولو كان ذلك قادحا فی روايتها لقدح فی روايت ابن عمر فانه لم يحضر ايضا۔ ولا مانع ان يكون النبی ﷺ قال اللفظين معا فانه لا تعارض بينهما۔ روايتهما عن النبی ﷺ انه قال انهم ليعلمون الان ان ما كنت اقول لهم حق۔ يويد روايت من روی انهم ليسمعون ولا ينافيه فان الميت اذا جاز ان يعلم جاز ان يسمع لان الموت ينافی العلم كما ينافی السمع والبصر فلو كان مانعا من البعض لكان مانعا من الجميع،

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جہاں بھی یہ گفتگو ہو کہ مردہ سنتا ہے یا نہیں جس کی بعض تائید کرتے ہیں اور بعض نفی کرتے ہیں بغیر کسی شک کے یہ کہنا چاہئے کہ اگر وہ چاہے، تو سنتا ہے اور اگر وہ نہ چاہے تو نہیں سنتا ہے، مگر بہر حال وہ زندہ نہیں ہے اور اب فطری اور طبعی حالت میں نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ظاہر آیت قرآنی سے مردوں کے نہ سننے کی تائید ہوتی ہے مگر اس بات کے پیش نظر کہ سماع اموات سے متعلق احادیث صحیح اور معتبر ہیں اور موضوع عقیدتی نہیں ہے بعض علما نے آیات قرآنی اور احادیث صحیح کے درمیان مفاہیم کو تطبیق دینا چاہا ہے کہ نفی اسماع سے نفی سماع مراد نہیں لیا جا سکتا، ان تمام باتوں کے باوجود تکفیری لوگ آیات قرآن سے استثناء کرتے ہوئے عدم سماع کے ہی قائل ہیں۔ ناصر الدین البانی نے اس سلسلے میں ایک کتاب الآیات البینات فی عدم سماع الاموات تحریر کی ہے تاکہ اسلامی دانشوروں کی عمومی رائے کے مطابق مردوں کے عدم سماع کو مزید تائید و تقویت حاصل ہو سکے۔

حالانکہ برزخ کی زندگی سے متعلق ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ بہر حال مردے بھی سنتے ہیں درحالیکہ تکفیری لوگ بعض آیات سے استفادہ کرتے ہوئے اس کے منکر ہیں، آئندہ آنے والے اقتباسات میں ہم ان کے دلائل کا بھی جائزہ لیں گے۔

مردوں کے سننے سے متعلق آیات

تکفیری لوگ اپنے موقف کی تائید میں جن آیات کو پیش کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:

"انک لاتسمع الموتی ولا تسمع الصم الدعا اذا ولوا مدبرین" ۵۳ تم مردوں کو اپنی آواز نہیں سنا سکتے اور انہیں ہدایت نہیں کر سکتے وہ بہرے ہیں تم اپنی آواز کو اور اپنی دعوت کو ان تک نہیں پہونچا سکتے بالخصوص جب کہ وہ تمہیں اپنی پشت دکھا رہے ہیں۔

یہی آیت بالکل ایسے ہی سورہ روم کی آیت ۵۲ میں تکرار ہوئی ہے اور تکفیریوں نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے اسے اپنے موقف کی تائید میں پیش کیا ہے در حالیکہ ان کا پہلا غلط فرضیہ اس آیت سے غلط مفہوم نکالنا ہے کیونکہ انہوں نے " موتی" سے اس کے ظاہری معنی مراد لیے ہیں یعنی وہ لوگ جن کی روح ان کے بدن سے خارج ہو چکی ہے حالانکہ یہ حقیقت سب پر واضح ہے کہ آیات قرآنی کے ظاہری معنی کو اس کے قرائن اور شواہد کو نظر میں رکھے بغیر مراد لینے سے انحراف و گمراہی کا پورا امکان ہوتا ہے اور اس کے نتائج بہت نامطلوب ہوتے ہیں اور یہ کسی بھی صورت میں قرآنی منطق اور اسلامی نظریات سے سازگار نہیں ہوتا۔ غور طلب ہے کہ مد نظر آیۂ شریف کے قرائن و شواہد بہت واضح انداز میں اصل مفہوم کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ اس موقع پر "موتی" سے مراد ہر گز اس کے ظاہری معنی نہیں ہے بلکہ وہ منکرین وحدانیت ہیں جن کے دل مر چکے ہیں اور ان کے کانوں اور آنکھوں پر مہر لگ گئی ہے لہٰذا پیغمبر سے ارشاد ہے کہ آپ کی باتیں ان پر بے اثر رہیں گی جیسا کہ بعد والی آیت اس مفہوم کیلئے مضبوط قرینہ ہے:

"وماانت بہادی العمی عن ضلالتھم ان تسمع الا من یؤمن بایاتنا فھم مسلمون" ۵۴ اے رسول یہ لوگ اندھے ہیں اور راستہ بھٹکے ہوئے ہیں اور تم اندھوں کو راستہ نہیں دکھا سکتے اور انہیں گمراہی سے نہیں بچا سکتے تم صرف انہیں اپنی بات سنا سکتے ہو اور ہدایت کر سکتے ہو جو ہماری آیات پر یقین رکھتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو ہمارے آگے سراپا تسلیم ہیں۔

خداوند کریم نے اس آیت مذکور میں کفار کو نابیناؤں سے تشبیہ دی ہے۔ مختصر یہ کہ سورہ نمل کی آیت ۸۰ اور ۸۱ عوام کو چار گروہوں میں تقسیم کرتی ہے:

۱۔ وہ لوگ جو ظاہر اً زندہ ہیں مگر ایسے مردہ ہیں کہ ان میں حقیقتوں کو درک کرنے کی صلاحیت نہیں: "فانک لاتسمع الموتی" ۵۵

۲۔ ایسے بہرے لوگ جو حق بات سننے کے لیے آمادہ نہیں ہیں: " ولا تسمع الصم الدعا"۔

۳۔ ایسا گروہ جو حق کے چہرے کو دیکھنے سے محروم ہے: "وما انت بہادی العمی عن ضلالتھم"۵۶

۴۔ وہ مومن لوگ جو بصیرت، سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھیں رکھتے ہیں: "الا من یومن

بایاتنا فھم مسلمون"۔

ظاہر ہے کہ قرآن کریم اپنے مخاطبین کو متوجہ کرنے کے لیے انتہائی شائستہ تشبیہوں سے استفادہ کرتا ہے، ان آیات میں کفار، حق کو قبول نہ کرنے کی صورت میں مردوں سے مشابہ قرار دیئے گئے ہیں تاکہ انسانوں کو بہتر انداز میں بات سمجھائی جاسکے۔ واضح رہے کہ اس موقع پر سماع سے مراد محض سننا نہیں بلکہ سمجھنا بھی ہے کیونکہ مشرکین وکافرین ظاہراً سن بھی سکتے ہیں اور حضور اکرمؐ اپنی بات کو ان کے کانوں تک پہونچا بھی سکتے ہیں لہٰذا گفتگو سمجھنے سے متعلق ہے نہ کہ سننے سے چنانچہ اللہ نے اس آیت میں مزید واضح کردیا: " کفار چاہے ظاہراً کتنا ہی سنتے ہوں مگر آپ کی بات کو قبول نہیں کرتے"۔

ایک اور قرینہ جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سننے سے مراد سمجھنا اور قبول کرنا ہی ہے، آیت کا دوسرا جز ہے کہ سننے کو صرف مومنین سے مخصوص جانا گیا ہے۔ اس آیت میں اللہ اپنے حبیب سے ارشاد فرمارہا ہے: " تم مردوں تک اپنی آواز نہیں پہونچا سکتے" مگر آگے چل کے ارشاد ہوتا ہے "صرف مومنین تمہاری آواز کو سن سکتے ہیں" لہٰذا ان آیات میں نہ صرف یہ کہ سننے سے مراد سمجھنا ہے بلکہ "موتی" سے مراد کفار ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو رسول کی آواز نہیں سنتے اور جو لوگ رسول کی بات سننے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ مومن ہیں؛ اکثر مفسرین نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے جیسے قرطبی، طبری اور فخر رازی تاہم بعض افراد جیسے ناصر الدین البانی نے ایک شبہ کا اظہار کیا ہے کہ "گوکہ موتی سے مراد اس آیت میں کفار ہیں اور اس میں ان کے نہ سن پانے کو موتی (مردہ) سے تشبیہ دی گئی ہے مگر بہر حال مردے تو بدرجہ اولیٰ نہیں سنتے ہیں"۔ ابن قیم نے اس شبہ کا جواب دیا ہے: یہ آیت اس کافر کی طرف اشارہ کررہی ہے جس کا دل مرچکا ہے کیونکہ وہ حقائق کو درک کرنے کی اب صلاحیت نہیں رکھتا جس طرح کسی مردہ انسان کو کچھ دینا چاہیں تو وہ اس کے لئے بے سود ہے۔

چنانچہ کفار اور مردوں کے مابین وجہ مشترک یہی ہے جیسے پیغمبرؐ کی نصیحتوں کا مردوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ مرنے کے بعد ہدایت نہیں پاسکتے اور رسول اکرمؐ کی باتوں سے کسی بھی طرح بہرہ مند نہیں ہوسکتے اس لئے کہ وہ اس کا موقع کھوچکے ہیں کفار بھی اسی طرح ہیں یعنی چاہے جتنا حضور اکرمؐ انہیں وعظ ونصیحت کریں، حق کی دعوت دیں وہ قبول کرنے والے نہیں ہیں۔

اس شبہ میں البانی کی مشکل، ظاہر کی طرف بیش از حد جھکاؤ ہے انہوں نے سماع سے اس کے لغوی معنی مراد لیئے ہیں در حالیکہ شباہت کی وجہ سننا ہر گز نہیں ہے اس لیئے کہ اگر اس سے مراد اسی طرح سننا ہوتا جو لغوی معنی سے ظاہر ہوتا ہے تو بہر حال ظاہری طور پر کفار اور مردوں میں کوئی شباہت نہیں ہے کیونکہ کفار میں سننے کی صلاحیت ہوتی ہے چنانچہ وہ پیغمبرؐ کی آواز کو سنتے بھی تھے جبکہ مردوں کی قوت

سماعت جواب دے چکی ہوتی ہے اور ظاہری طور پر وہ کچھ سننے کے قابل نہیں ہوتے۔

اسلام دین امن صلح و دوستی اور محبت

دین اسلام کی اہم تعلیمات میں پر امن معاشرہ کو خصوصی مقام حاصل ہے، اسلام نے دنیا بھر میں امن وآشتی کو بحال رکھنے کے تعلق سے اس کی خصوصی تائید کی ہے یہی وہ دین ہے جس میں تعصب اور انتہا پسندی کو بہت ناپسند اور صلح وسلامتی کو ہمیشہ انسانوں کے لیے اہم اور آزادی بخش مانا گیا ہے۔

اگر رسول اکرمؐ کی سیرت اور ان کے اقوال کو تمام جہات پر نظر رکھتے ہوئے مطالعہ کیا جائے تو بآسانی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ دین اسلام، دین صلح وآشتی ہے اور کسی بھی رخ سے جنگ وجدال کو اس سے جوڑ کر نہیں دیکھا جاسکتا، حضور اکرمؐ کا مقصد بعثت ہی یہی تھا، بنیادی طور پر جس دین کی اساس ہی رحمت ہو جس کے پیغمبرؐ، یہی پیغام لے کے آئے ہوں: وماارسلناک الّا رحمۃ للعالمین ۵۷ ہم نے آپ کو عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا، خود حضرت رسول خداؐ ارشاد فرماتے ہیں: وانابنی الرحمہ ۵۸ وانماانا رحمۃ مھداہ ۵۹ اصحاب پیغمبر نے ایک دفع بارگاہ رسالت مآب میں مشرکوں کی طرف سے کی جانے والی اہانت آمیز حرکتوں کے سلسلے میں کہا: یا رسول؛ اس قوم کے حق میں لعنت بھیجئے تاکہ ان کے شر سے نجات مل جائے۔ حضور نے ان کے جواب میں فرمایا: انی لم ابعث لعانا وانما بعثت رحمہ ۶۰ میں لعنت کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا ہوں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ چنانچہ آپ کی پوری سیرت عفو وبخشش کے نمونوں سے بھری ہوئی ہے۔ حضرت حمزہؓ کی شہادت اور اس سلسلے میں وحشی کو معاف کر دینا آپ کے رحمۃ للعالمین ہونے کی واضح مثال ہے۔ محبت اور عدم تشدد ہی اسلام کی بنیادوں کو تشکیل دیتے ہیں۔ قرآن کریم اور رسول اکرمؐ نے اسی روش زندگی کی تاکید کی ہے اور تمام احکام اسلام اسی پر استوار ہیں۔ قرآن کریم نے عرب کے جاہلوں کو جنہیں جنگ وخون ریزی کی عادت پڑ چکی تھی اپنے پہلے ہی پیغام میں آشتی کی دعوت دی اور ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: وان جنحوا للسلم فاجنح لہا وتوکل علی اللہ ۶۱ جب وہ صلح کی پیش کش کریں تو تم بھی ان سے صلح کرلو، یہی نہیں بلکہ دین اسلام تو میدان جنگ میں صلح وآشتی کا خواہاں نظر آتا ہے: "ولاتقولوالمن القی الیکم السلم لست مؤمنا" ۶۲ اگر کوئی تمہارے پاس مصالحت آمیز رویہ اختیار کرے تو تم اسے بے ایمان مت کہنا۔

مفسرین کی رو سے اگر کوئی مسلمانوں سے جنگ کرتے وقت صلح کی پیش کش کرے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس کا مثبت جواب دیں اور جنگ روک دیں ۶۳ "سلام" اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے "ھواللہ الّذی لاالہ الّاھوالملک القدوس السلام" ۶۴ وہ وہی خدا ہے جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے وہی پاکیزہ اور سالم حاکم ہے۔ قرآن کریم نے چودہ سو سال پہلے ہی عالم انسانیت کو عالمی صلح کا مژدہ سنایا

تھا: "یا ایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السّلم کآفۃ ولا تتّبعوا خطوات الشّیطان" ۶۵ اے ایمان والو سب داخل امن وآشتی ہو جاؤ اور شیطان کی پیروی سے بچو، قرآن کریم نے مسلمانوں کے ساتھ امن ومصالحت کے چولی دامن کے ساتھ کو یوں بیان کیا ہے:" فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السّلم فما جعل اللہ لکم علیھم سبیلا"۔ ۶۶ جب وہ جنگ روک دیں اور آشتی کرنا چاہیں تو ان کے خلاف برسرپیکار ہونے کا پھر کوئی راستہ خدا کی طرف سے نہیں رہ جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے جو آیات صلح وآشتی پر دلالت کرتی ہیں، نسخ (منسوخ) نہیں ہوئی ہیں اور جنگ وجدال کو اس صورت میں روا رکھا گیا ہے جب صلح کی کوئی گنجائش ہی نہ ہو۔ لفظ اسلام اور اس کے مشتقات کو قرآن کریم میں سو سے زائد مقام پر دیکھا جاسکتا ہے اور اس کے بالکل برعکس حرب یعنی جنگ سے متعلق مشتقات قرآن کریم میں صرف ۶ مقام پر نظر آتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ، تاریخ اسلام کی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے صحیح معنی میں صلح پسندی کے لیے ڈپلومیسی کا رویہ بھی اختیار کیا اور مختلف وفود کو حکومتوں اور سربراہوں کے ساتھ پرامن معاشرتی رابطوں کے فروغ کے لیے بھیجے جن میں مصر، اور فارس کو ارسال کیے گئے خطوط خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

سلام، سلم کے مشتقات میں سے ہے۔ السلام علیکم۔ وعلیکم السلام۔۔ ایسے کلمات ہیں جو روزانہ کروڑوں مسلمانوں کی زبان پر جاری ہوتے ہیں، واضح رہے کہ اس کے اندر امن وآشتی اور صلح ودوستی کے بے پناہ مفاہیم چھپے ہوئے ہیں، اسی طرح مسلمان اپنی تمام نمازوں کو اسی لفظ کے ساتھ اختتام پذیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں" السلام علیکم ورحمۃ اللہ" جو محبت ورحمت اور صلح و دوستی کے گرانقدر پیغاموں سے مملوء نعرہ ہے۔ مورخین نے لکھا ہے رسول اکرمؐ ہجرت سے قبل جب تک مکہ میں تشریف رکھتے تھے انہوں نے کبھی جنگ نہیں فرمائی مگر جب مدینہ تشریف لے گئے اور مسلمانوں پر ظلم ہونا شروع ہوا تو آپ نے کفار ومشرکین کے مقابل اپنے دین کے دفاع میں حکم خدا سے جہاد کو واجب سمجھا اور مسلمانوں نے اسی کا اتباع کیا۔

قرآن کریم کی جنگ سے متعلق مشہور آیت، سورہ توبہ کی ۳۶ ویں آیت ہے: "وقاتلوا المشرکین کآفۃ کما یقاتلونکم کافۃ واعلموا ان اللہ مع المتّقین "مفسرین نے اس آیت کی اس طرح تفسیر فرمائی ہے:

۱۔ اس آیت کا مقصد، انسانی زندگی کے حق کا تحفظ ہے لہٰذا اگر دشمنان اسلام مسلمانوں سے یہ حق لینا چاہیں تو ضروری ہے کہ مسلمان اپنے حق کا دفاع کریں جو کہ ایک جائز حق ہے انہیں دشمنوں کے مقابل کھڑا ہو جانا چاہئے اور یہ سب جانتے ہیں کہ ایسا دفاع، انسان کے فطری قوانین سے بالکل سازگار ہے۔

۲۔ آیت مبارکہ میں آیا ہے: چونکہ وہ لوگ تم سب سے جنگ کرنا چاہتے ہیں تو تم بھی ان کے ساتھ جنگ کرو کیونکہ وہ مسلمانوں سے ٹکرا رہے ہیں اور مسلمانوں کو بھی چاہئے کہ وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اس زیادتی کا جواب دیں۔ اگر غزوات پیغمبر کا مطالعہ کریں تو ہم پائیں گے کہ ان سب کی اصلی ماہیت دفاع ہے کوئی بھی اسلامی جنگ، اسلام کو کسی پر تھوپنے کے لیے کبھی نہیں ہوئی کیونکہ اسلام اسے قبول نہیں کرتا اسی لیے جتنے بھی غزوات رسول کے دور میں واقع ہوئے وہ در اصل جوابی کارروائی میں تھے کہ جن سے اسلام کا دفاع مقصود تھا۔

یہ مشرکین ہی تھے جنہوں نے دوستداران رسالت مآب کو غریب الدیار کر دیا تھا اگر کافروں نے رسول کے چاہنے والوں کو مکہ سے باہر نہ نکالا ہوتا اور مدینہ میں ان کے خلاف نبرد آزمانہ ہوتے تو کسی بھی قیمت پر جنگ نہیں ہوتی، یہی مشرکین مکہ تھے جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف مدینہ پر حملہ کر دیا اور جنگ احد اور جنگ احزاب کے ذریعہ مرکز اسلامی کو تاراج کرنے کی کوشش کی در حالیکہ ہم اس زمانے میں بھی اسلامی حکومتوں کا، حبشہ کی حکومت سے صلح آمیز روابط کا سلسلہ بھی دیکھتے ہیں۔

گذشتہ دنوں سے اسلام دشمن طاقتوں نے نئے ڈھنگ اور نئی آواز کے بہانے دنیاوالوں کے ذہن کو شبہات میں مبتلا کرتے ہوئے جہاد کو مسلحانہ حملہ اور جنگ وجدال سے تعبیر کیا ہے یہاں تک کہ اب تو دنیا کی معتبر لغتوں میں بھی جہاد کے معنی براہ راست جنگ درج کیے جارہے ہیں حالانکہ جہاد کی مختلف قسمیں ہیں ان میں سے ایک کا نام اسلحہ بدست ہو کر لڑنا بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاد کا مقصد جو دین اسلام میں بیان کیا گیا ہے وہ امن قائم کرنا، حاکمیت کو یقینی بنانا اور اسلام و مسلمین کا دفاع کرنا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضور اکرمؐ کی ساری جنگیں دفاعی تھیں، اپنی جانب سے حملہ کی شروعات پر مشتمل نہیں تھیں۔ روایات میں ہے کہ جب آنحضرتؐ لشکری دستوں کو جنگ پر روانہ کرتے تھے تو تاکیداً فرمایا کرتے تھے: "ولا تقتلوا شیخاً فانیاً ولا طفلاً صغیراً ولا امرأۃ ولا تغلو واصلحو واحسنوا واللہ یحب المحسنین"۔ ۶۷ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا، خیانت نہ کرنا، صلح کو در پیش رکھنا نیکی کرنا کیونکہ اللہ نیکی کرنے والے کو عزیز رکھتا ہے۔ یہ اسلام و پیغمبر اسلام کی عظمت ہے جن کی تعلیمات میں ہمیشہ صلح وآشتی کی تاکید ملتی ہے اور آپس میں بھائی چارہ کی دعوت دی جاتی ہے۔

تبلیغ دین کی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان اس سے پہلے کہ مشرکوں کے ظلم وستم کو اکھاڑ پھینکیں خود استبداد وبربریت کا نشانہ نہ بنے ہیں، گھر سے بے گھر ہوئے ہیں، شہر بدر ہوئے اور حبشہ جیسی جگہوں پر جا کر پناہ گزیں ہوئے ہیں، مسلمانوں نے کبھی زبردستی کا مظاہرہ نہیں کیا، مگر کوئی غیر منطقی موقف پر اڑ گیا تو اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جس کا وہ حقدار تھا جب تک مسلمانوں سے خود کوئی نہیں الجھا انہوں نے

کسی کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ مسلمانوں کے ساتھ حبشہ کی حکومت کا برتاؤ اس کا ثبوت ہے۔ جزیرۂ عرب میں مسلمانوں اور عرب قبائل میں کوئی جنگ نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ انہوں نے حملہ ہونے کی صورت میں اپنا دفاع کیا، حملہ آوروں کو روکنے کو شش کی۔ اسلام نے جب جب شمشیر بکف ہونے کو لازم جانا وہ اضطراری حالات ہیں اور جس میں شمشیر بکف ہوا ہے حیات بخش ثابت ہوا ہے۔ اسلام میں حق زندگی، حق آزادی اور دعوت، عقائد سے مربوط ہے۔ اگر ہم دنیا کے موجودہ منظر نامہ کو دیکھیں اور تاریخ اسلام کو سمجھنا چاہیں تو ہم دیکھیں گے کہ شاذو نادر مقامات کے علاوہ اسلام کی ترویج میں تلوار کا رول نہیں رہا ہے۔ ان جگھوں پر جہاں جنگ کم ہوئی ہے اسکا سبب مسلمان ہیں اس کے لیے انڈونیشیا، ہندوستان اور چین کا بطور مثال ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اس رخ سے اسلام کے بنیادی آئین نے مختلف اقوام کے مابین رابطوں کی استواری کو امن ودوستی پر منحصر جانا ہے اور جنگ محض اس صورت میں ہے جب شروعات دوسروں کی طرف سے ہو چکی ہو۔

امن کو برقرار رکھنے اور ادیان الٰہی کا دفاع کرنے کے لیے جہاد کو فرض قرار دیا گیا تھا: قرآن کریم اس سلسلے میں یوں گویا ہے۔ "ولولادفع الله النّاس بعضهم ببعض لّهدّمت صوامع وبيَع وصلواتٌ ومساجد يذكر فيها اسم الله كثيراً ولينصرنّ الله من ينصره ان الله لقوى عزيز"۶۸ اگر اللہ نے بعض لوگوں کا بعض کے ہاتھوں دفاع نہیں کیا ہوتا تو راہبوں کی خانقاہیں، عیسائیوں کے گرجا گھر، یہودیوں کی عبادتگاہیں اور مسلمان کی مسجدیں کہ جہاں اللہ کا نام لیا جاتا ہے ویران ہو جاتیں؛ بیشک اللہ قادر مطلق ہے۔ جہاد کے کبھی یہ معنی نہیں رہے کہ جنگ کے ذریعے دوسروں سے زبردستی اسلام قبول کرایا جائے کیونکہ اس تصور کا اسلام کی اصل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ فکر قرآن کریم کی روح ہدایت کے ۶۹ بھی منافی ہے۔

پیغمبرؐ کی سیرت میں کہیں نہیں ملتا کہ کسی عیسائی کو اس لیئے اسلام قبول کرنا پڑا کیونکہ اسے قتل ہو جانے کا ڈر تھا بلکہ معاملہ اس کے برعکس تھا رسولؐ نے نجرانی عیسائیوں سے انتہائی محترمانہ برتاؤ کیا یہاں تک کہ انہیں اجازت دی کہ وہ مسلمانوں کی مسجدوں میں آکر اپنی عبادتیں انجام دیں۔ مورخین نے صدر اسلام کے بہترین دور میں، صلح حدیبیہ کے اوائل سے مخصوص وہ صلح لکھی ہے جو مسلمانوں اور قریش کے درمیان ہوئی۔ ان دوسالوں میں کثیر تعداد میں لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے اس کی تعداد آغاز اسلام سے لیکر ۲۰ برس میں ہونے والے مسلمانوں سے بھی زیادہ ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ غیر مسلموں سے روابط کی بنیاد اسلام میں صلح ودوستی پر استوار ہے البتہ حملہ ہو جانے کی صورت میں سرزمین اسلامی کا دفاع مسلمانوں کا قانونی اور شرعی حق ہے یہی وہ حق ہے جو آج

بھی بین الاقوامی قانون کا بھی حصہ ہے۔ اقوام متحدہ کے منشور کے آرٹیکل ایاون میں اسے صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اگر یہ دین اسلام کو ایک مکمل دین مانتے ہیں تو یہ فطری سی بات ہے کہ جہاں اس دین نے اخلاقی ضابطے طے کئے وہیں جنگ اور صلح کے آداب کو بھی معین کیا ہے اور ظاہر ہے انسانی زندگی میں جنگ و صلح ایک ناگزیر امر ہے۔

ہمارے قانونی نظام میں بھی اس سلسلے کے قوانین کا پایا جانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ہم ہمیشہ انہی حالات سے دوچار رہیں گے اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ چونکہ اسلام میں جہاد فرض ہے لہٰذا مسلمانوں کو ہمیشہ غیر مسلمین سے جنگ کرنی چاہئے! دوسری طرف سوال یہ ہے کہ کیا دیگر ادیان ہمیشہ صلح وآشتی سے ہی ہمکنار رہے ہیں اور انہوں نے کبھی جنگ نہیں کی ہے؟ کیا عیسائی تاریخ میں دوسروں کو عیسائی بنانے کے لیے جنگوں کی مثال نہیں ملتی؟ کیا عیسائیوں کے ذریعے کی گئی جنگوں کو حضرت عیسیٰؑ سے منسوب کیا جاسکتا ہے جن کے دین وشریعت کو دین صلح سے یاد کیا جاتا ہے؟!

وہ لوگ جو اسلام کو اسلحوں کا دین قرار دیتے ہیں اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ اس دین نے اپنے تابعین پر جہاد فرض قرار دیا ہے اور وہ جہاد کو اسلحوں کی جنگ سے ماوراء سمجھتے ہیں تب تو وہ کسی حد تک درست کہتے ہیں البتہ اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ دین اسلام اسلحوں کے زور پر پھیلا ہے تو وہ شدید غلط فہمی کے شکار ہیں کیونکہ دین اسلام دین عقل ومنطق ہے، صلح ورحم دلی، عفو وبخشش ہے، دین اسلام اپنی عقلانیت کی بناپر عالمی ہوتا گیا ہے اس نے ہمیشہ منطقی استدلال کی بنیاد اپنی طرف دعوت دی ہے جیسے " ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالّتی ھی احسن" ۷۰۔

اسلام قلبی یقین واعتقاد کا دین ہے جسے مکمل ارادہ اور اختیار کیساتھ قبول کیا جاتا رہا ہے نہ تلوار اور اسلحہ کے بل پر، اسلام کی دعوت زبان پر منحصر نہیں ہے بلکہ عمل سے یہ پیغام دیا جاتا ہے چونکہ یہ دین دین صلح وآشتی، رحمت ومرحمت ہے، ہاں مسلمانوں کے پاس اسلحہ ہے تو اپنے جائز دفاع کے لیئے، دفاع اور دین کی اشاعت کی بنیاد، دعوت پر ہے حملوں اور قتل وغارت پر نہیں۔

نتیجہ

اگرچہ امت اسلامیہ میں ایسے لوگ ہیں جو تکفیری رجحانات کے نتیجہ میں سارے مسلمانوں کو کافر ثابت کرنے پر تلے ہیں مگر اسے اسلامی تعلیمات پر حمل نہیں کیا جانا چاہئے کیونکہ یہ قانون، انسانی اور غیر الٰہی ضابطوں سے مبرّا ہے، ان غیر انسانی حرکتوں کو چند نام نہاد مسلمان، غیر عقلی اور بے دین افکار کے حامل افراد پر حمل کیا جانا چاہیئے۔ اس سلسلے میں علمائے اسلام کو آگے آنا چاہیئے اور تکفیریت کا مقابلہ کرنا

چاہئے اور ان کو بے نقاب کرنا چاہئے، ان کے فکری اصولوں سے لوگوں کو آگاہ کرنا چاہئے اور اتحاد کا نعرہ بلند کرتے ہوئے افراط و تفریط کے خلاف سنجیدہ اقدام کرنا چاہئے۔

حوالے جات:

۱۔ لسان العرب، مادہ (وحد) والقاموس المحیط، ج ۱، ص ۳۴۳

۲۔ سورۂ اعراف، آیت ۵۴

۳۔ سورۂ فاتحہ، آیت ۱

۴۔ سورۂ یونس، آیت ۳۱

۵۔ سورۂ لقمان آیت، ۲۵ و نیز سورۂ مؤمنون آیات ۸۴۔۸۹

۶۔ سورۂ محمد، آیت ۱۹

۷۔ سورۂ انعام، آیات ۱۶۲ و ۱۶۳

۸۔ سورۂ فاتحہ، آیت ۴

۹۔ سورۂ بینہ، آیت ۵

۱۰۔ سورۂ الذاریات، آیت ۵۶

۱۱۔ سورۂ اعراف، آیات ۵۹، ۶۵، ۷۳، و ۸۵؛ سورہ ہود، آیات ۵۰ و ۶۰ و ۸۴؛ مؤمنون، آیات ۲۳ و ۳۲۔

۱۲۔ سورۂ شوریٰ، آیت ۱۱

۱۳۔ سورۂ اعراف، آیت ۱۸۰

۱۴۔ سورۂ اخلاص، آیت ۴

۱۵۔ سورۂ طٰہٰ، آیت ۱۱۰

۱۶۔ سورۂ مریم آیت ۶۵ اور رجوع کریں: شرح العقیدۂ الطحاویۂ، ص ۷۶؛ و تسہیل العقیدۂ الاسلامیہ، ص ۳۷

۱۷۔ شرح الحدیقۂ العقیدہ، ص ۸۸

۱۸۔ مجموع المفتاوی، ج ۳، ص ۹۸

۱۹۔ سورۂ زخرف، آیت ۹

۲۰۔ ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱، ص ۱۷۰ و ۱۷۱ (تھوڑی تبدیلی کے ساتھ)

۲۱۔ سورۂ سباء، آیت ۲۲

۲۲۔ سورۂ نحل، آیت ۳۶

۲۳۔ سورۂ یٰس، آیت ۶۰
۲۴۔ سورۂ شعراء، آیت ۲۲
۲۵۔ سورۂ نساء، آیت ۶۰
۲۶۔ فتح الباری، ج ۱۳، ص ۱۰۵
۲۷۔ سنن ابو داود
۲۸۔ سنن ترمذی
۲۹۔ سورۂ فرقان، آیت ۴۳
۳۰۔ سورۂ نحل، آیت ۱۴
۳۱۔ ایضاً، آیت ۱۰۶
۳۲۔ سورۂ بقرہ، آیت ۸
۳۳۔ سورۂ نساء آیت ۹۴
۳۴۔ صحیح مسلم، ج ۱، ص ۳۳
۳۵۔ صحیح بخاری، ج ۳، ص ۱۶۲
۳۶۔ سنن نسائی، ج ۷، ص ۷۵
۳۷۔ شرح مقاصد، ص ۵۲
۳۸۔ عقیدۂ الطحاویہ، ص ۲۰
۳۹۔ شرح فقہ اکبر، ص ۱۸۸
۴۰۔ شرح فقہ اکبر، ص ۱۸۹
۴۱۔ تلخیص المحصل، ص ۴۰۵
۴۲۔ شرح المواقف، ج ۷، ص ۳۳۹
۴۳۔ ابن حزم، ص ۲۷۴
۴۴۔ ماخوذ از الفصول المہمۃ، ص ۳۴
۴۵۔ غزالی، ص ۲۶۸
۴۶۔ ایضاً، ص ۲۶۹ و ۲۷۰
۴۷۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن
۴۸۔ ایضاً

۴۹۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز
۵۰۔ سورۂ فاطر، آیت ۲۲
۵۱۔ صحیح بخاری، حدیث شمارہ ۳۹۷۶
۵۲۔ ایضاً، ج ۳، ص ۲۳۴
۵۳۔ سورۂ نمل، آیت ۸۰
۵۴۔ ایضاً، آیت ۸۱
۵۵۔ سورۂ روم، آیت ۵۱
۵۶۔ ایضاً، آیت ۵۲
۵۷۔ سورۂ انبیاء، آیت ۱۰۷
۵۸۔ سنن ترمذی، ص ۱۰۶
۵۹۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج ۳، ص ۲۲۱
۶۰۔ ایضاً، ج ۳، ص ۲۱۱
۶۱۔ سورۂ انفال، آیت ۶۱
۶۲۔ سورۂ نساء، آیت ۶۳
۶۳۔ قرطبی، الجامع الاحکام القرآن، ج ۵، ص ۱۴۰ و ۳۳۶
۶۴۔ سورۂ حشر، آیت ۲۳
۶۵۔ سورۂ بقرہ، آیت ۲۰۸
۶۶۔ سورۂ نساء، آیت ۹۰
۶۷۔ الشامی، ج ۷، ص ۶ یا ج ۶، ص ۷
۶۸۔ سورۂ حج، آیت ۴۰
۶۹۔ "لااکراہ فی الدین"
۷۰۔ سورۂ نحل، آیت ۱۲۵